جلد04شمارہ02، 2023

اصغر ندیم سید کی ناول نگاری: تہذیبی و معاشرتی تنوعات کے تناظر میں

Asghar Nadeem Syed's novel writing: In the context of cultural and social diversity

ڈاکٹر سائرہ ارشاد[1]، سمیرا واثق[2]

[1] لیکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ صادق ویمن یونیورسٹی، بہاولپور، [2] ایم ایس سکالر، شعبہ اردو، گورنمنٹ صادق ویمن یونیورسٹی، بہاولپور

Dr. Saira Irshad[1], Sumaira Wasiq[2]

[1] Lecturer, Dept. of Urdu, Govt. Sadiq Woman University BWP

[2] MS Urdu Scholar, Govt. Sadiq Woman University BWP

eISSN: 2789-6331
pISSN: 2789-4169

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT:
Asghar Nadeem Syed has diverse aspects. He has celebrated his position in the Urdu world as a poet, fiction writer, novelist and dramatist at the same time. His two novels "Toti Hoi Tanab Udhar" and "Dasht-i Amkaan" while a novella "Aadhe Chand Ki Raat" have been released. A writer is a conscious member of the society who carefully studies every small incident in the society and transforms it into a story. Asghar Nadeem is a lamenter of sinking, sighing and breathing civilization as a fiction writer. He belongs to the tribe of Urdu playwrights who prioritize story over commercialism. Asghar Nadeem Syed is a believer of enlightenment and objective truths, his novels are a rich reflection of civilization and society.

KEYWORDS: Social and economic values, sorrows, mourning of civilization, colonial system, exploitation, coercion and violence

اصغر ندیم سید کی متنوع جہات ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، افسانہ، ناول اور ڈرامانگار کی حیثیت سے اُردو دنیا میں اپنی حیثیت منوا چکے ہیں۔ ان کے دو ناول "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" اور "دشتِ امکاں" جب کہ ایک ناولٹ "آدھے چاند کی رات" کے عنوان سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ادیب سماج کا باشعور فرد ہوتا ہے جو معاشرے میں ہونے والے ہر چھوٹے بارے واقعے کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور اسے کہانی کی صورت میں ڈھال دیتا ہے۔ اصغر ندیم بنیادی طور پر فکشن نگار کی حیثیت سے ڈوبتی، سسکتی اور سانس لیتی تہذیب کا نوحہ گر ہیں۔ وہ اردو ڈراما نگاروں کے اس قبیل سے ہیں کہ جو کمرشل ازم کی بجائے کہانی کو مقدم جانتے ہیں۔ اصغر ندیم سید روشن خیالی اور معروضی صداقتوں کے امین ہیں، ان کے ناول تہذیب و معاشرت کے بھرپور عکاس ہیں۔

غلام اصغر شاہ (۱۴ مئی ۱۹۴۹ء کو ملتان کے گاؤں ٹبی شیر خان میں پیدا ہوئے) اصغر ندیم سید کے نام سے جدید اُردو نثر اور شاعری کا اہم نام ہے۔ اصغر ندیم سید کا تعلق ملتان سے ہے۔ جہاں انھوں نے درس و تدریس کی ابتداء کی۔ بعد ازاں وہ لاہور چلے گئے۔ ٹی وی کے لیے کئی ڈرامے بھی لکھے۔ اصغر ندیم سید کی متنوع جہات ہیں۔ وہ اُردو دنیا میں بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈراما نگار اپنی حیثیت منوا چکے ہیں۔

اصغر ندیم سید کے دو ناول "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" اور "دشتِ امکاں" جب کہ ایک ناولٹ "آدھے چاند کی رات" کے عنوان سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے پہلے ناول "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" میں ایسا منفرد انداز اپنایا ہے جو حقیقت اور افسانے کی حدود کے ساتھ پڑھنے والوں کو اس بات کا بھی یقین دلاتا ہے کہ ہر معاشرے اور سماج کی اپنی تہذیب و ثقافت ہوتی ہے جو انسان کی شناخت کے ساتھ ضرورت بھی ہے۔ ناول میں ایسے شہر کی روداد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جو آغاز سے ہی بے شمار تبدیلیوں سے گزرا ہے۔ اس پر نہ صرف غیر ممالک نے کئی بار حملے کئے اور اسے برباد کرنے کی بھرپور کوشش کی جب کہ اس شہر کے رہنے والوں کو موت، نقل مکانی اور پسماندگی کا سامنا کرنا پڑا۔:

"ناول کا موضوع ایسے حالات و واقعات ہیں جو روزانہ ہماری زندگی میں پیش آتے ہیں۔ ایسے واقعات جن سے زندگی کے ہر موڑ پر ہمیں یا ہمارے دوستوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ خوشی کے حالات اور واقعات ہوں یا یاس انگیز اور حزن آفریں حالات، لیکن جنہیں ہم دیکھتے ہی پہچان لیں وہی ناول کا موضوع بن سکتے ہیں۔"[۱]

ہم اپنے ماضی سے کٹ نہیں سکتے تاریخ کے نقوش کہیں نہ کہیں ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ جن کو اکثر لوگ کتابی صورت میں ڈھال دیتے ہیں تاکہ اپنے جذبات اور ماضی سے دوسروں کو روشناس کرائیں۔ تاریخی کہانیوں کی یہ خوبی ہے کہ ہر دور اور شہر میں کئی دفن شدہ کہانیاں تخلیقی سانچے میں ڈھل کر نہ صرف ہمیشہ زندہ رہتی ہیں بلکہ سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہیں۔ ناول "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" میں ایسے ہی مٹتے ہوئے شہر کی داستان لکھی گئی ہے۔:

"اس کتاب کو ناول کہنا زیادہ مناسب ہے، یہ کتاب سیاست کا گھن چکر ہے، اس نوعیت کے تجربے کم ہوئے ہیں، کوئی قاری اگر یہ سمجھتا ہے کہ اصغر ندیم سید کی کتاب کا ایک صفحہ پڑھنے کے بعد وہ اسے بعد میں پڑھنے کے لیے رکھ چھوڑے گا تو یہ اس کی بھول ہو گی کیونکہ یہ کتاب قاری کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔" [۲]

اصغر ندیم سید نے تہذیبی قصے اور کہانیوں سے بھرپور اس ناول میں ایک ایسے شہر کا ذکر کیا ہے جو آج بھی اپنا وجود رکھتا ہے۔ اس ناول میں کردار جب کُھلے دریچے سے جھانکتے ہیں تو مسکرا دیتے ہیں اور جب یہی کردار اپنی کم مائیگی پہ آجائیں تو آنسو بہانے لگتے ہیں۔ اس ناول کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اصغر ندیم سید نے کہانی کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے جسے پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ دراصل دنیا کے

ان تمام شہروں کی داستان ہے جنہیں حملہ آوروں کی وجہ سے اپنی ثقافت، تہذیب اور خصوصیات سے محروم ہونا پڑا اور پھر معاشی اثرات کے تحت عالمگیریت کا مسئلہ بھی در پیش آیا۔:

"He has not mentioned the name of the City, but the events, characters and their depiction point towards Multan, the birthplace of the author." [۳]

"ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" ناول کی کہانی قدیم گھرانوں، خانقاہوں، جاگیرداروں کی ذاتی زندگی اور شہر کی روایات و ثقافت کے بہت سے پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہے۔ کہانی کے کردار بھی سماجی طاقت اور جنسی تعلقات کے تال میل سے ہی تخلیق کیے گئے ہیں جن پر برسوں سے ہمارے معاشرے کی بنیادیں قائم ہیں۔ اس ناول میں پاکیزگی و لالچ کو کرداروں اور واقعات کے ذریعے سماجی و معاشی زندگی، باہمی میل جول، معاشرتی ناہمواری اور پُراسراریت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

نو آبادیاتی نظام کی بدولت سائنسی و معاشی ترقی نے جس طرح قدیم تہذیب و معاشرت پر مبنی شہروں کے مراکز پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ناول "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" اس صورتحال کا بھرپور عکاس ہے۔ ناول کے مختلف اجزا الگ الگ مگر باہم مربوط انداز میں کہانی کو بیان کرتے ہیں۔ ناول کا دائرہ کار دراصل جاگیرداروں اور خانقاہوں کی سماجی طاقت اور اقتدار رکھنے والے خاندانوں کے گرد گھومتا ہے۔ اردو ادب میں گمشدہ تہذیبیں اور مٹتے ہوئے شہر اہم موضوعات شمار کیے جاتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار "امام بخش" ہے جو شہر کی بنیاد ڈالنے سے لے کر ارتقائی مراحل تک کی زمانی تبدیلیوں کا گواہ ہے۔ "امام بخش" شہر کی جڑوں میں موجود جاگیرداروں اور گدی نشینوں کے عیش اور ظلم کی کہانیوں سے واقف ہے۔ کہانی کا دوسرا دائرہ عورتوں کے گرد گھومتا ہے جن کا تعلق حرم کی طاقت یا محرومی کی لکیروں سے جڑا ہوا ہے۔ کچھ نسوانی کردار بالواسطہ یا بلاواسطہ سماجی اور سیاسی طاقت سے جڑی ہوئے ہیں۔ جیسے ہی یہ دونوں دائرے ایک دوسرے سے منقطع ہوتے ہیں تو کہانی ڈرامائی انداز اختیار کر لیتی ہیں۔:

"جاگیردار اور خانقاہی سماج میں ایسے کردار خاص طور پر اہم رہتے ہیں جن کی رسائی اہلِ حکم اور اہلِ حرم تک با آسانی ہوتی ہے اور وہ ان تمام رازوں اور کہانیوں کے امین ہوتے ہیں جن کے ارد گرد بظاہر تقدیس اور اعلیٰ روایات اور اقدار کی چادر تنی ہوتی ہے۔" [۴]

ناول "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" میں ملتان شہر کی معاشرتی زندگی، اخلاقی اقدار اور روایات کے ساتھ ساتھ روہی کی صحرائی زندگی بھی دکھائی دیتی ہے۔ عورت پر ہونے والے ظلم و ستم کو بھی تلخ اور طنزیہ انداز سے پیش کیا گیا ہے، اس ناول میں جملوں کی بناوٹ اور ہیئت تناسب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اصغر ندیم سید کے ہاں مواد، موضوع، کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ، جزئیات نگاری، تشبیہات و استعارت، حقیقت نگاری، جنس اور شاعرانہ انداز جیسی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اصغر ندیم سید نے کرداروں کے رہن سہن اور مزاج کے مطابق الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ یہ انداز ہی اصغر ندیم سید کی پہچان بنا ہے۔ زبان و جملوں کی سادگی کی مثال دیکھیے۔:

"میری تو زندگی بھی سزا ہی تھی مگر من مٹھار جاؤ اور اگر ہمت ہے تو جمالاں کو لے آؤ اور میری سزا خود بخود ختم ہو جائے گی۔" [۵]

اصغر ندیم سید نے اپنے ناول "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" میں کئی جگہ کسی اہم بات یا ڈر و خوف کی کیفیت پر سوال اُٹھا کر قارئین سے جواب طلب کئے ہیں۔ ان سوالیہ انداز میں روزمرہ زبان اور الفاظ کی سادگی بھی نظر آتی ہے۔ اس ناول میں نو آبادیاتی جبر کے نتیجے میں جنم لینے والی طبقاتی کشمکش اور سرمایہ داریت کے خلاف ناول نگار کا واضح موقف ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ معاشرے میں موجود بے رحمی اور جبر و استحصال پر اصغر ندیم سید کی تحریری میں بعض اوقات تلخ اور طنزیہ انداز غالب آجاتا ہے۔ اس ناول میں بھی وہ حقیقت بیان کرتے ہوئے تلخ اور طنزیہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔:

"ہر کہانی غیبت ہی تو ہوتی ہے۔ اس میں جو لوگ آتے ہیں، ان کا پیٹ ننگا ہوتا ہے۔ ان کی پیٹھ ننگی ہوتی ہے۔ ان کے کپڑے کہانی کار اتارتا ہے۔ وہ چاہے منٹو ہو یا بیدی سب غیبت کرتے تھے۔۔۔۔۔ مطلب یہ کہ کسی نہ کسی کی کہانی پیدا تو انسانوں کی زندگیوں میں سے ہوتی ہے اور جب ہم ان کی زندگیوں کو ننگا کرتے ہیں تو یہ غیبت سے بھی بڑا جرم ہے۔" [۶]

فلیش بیک تکنیک زیادہ تر فلموں اور ڈراموں میں ہوتی ہے مگر بیسویں صدی میں ناول، افسانے اور شاعری میں بھی اس تکنیک کا بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے اور آج اُردو ادب میں یہ فن اہمیت کا حامل بن گیا ہے۔ اصغر ندیم سید نے اس تکنیک کا استعمال اپنے ناولوں میں بخوبی کیا ہے

۔

اصغر ندیم سید تبصرے کی تکنیک اور واحد متکلم کردار کے ذریعے گفتگو میں تجسس پیدا کرتے ہیں۔ قاری سے براہ راست مخاطب ہونے کا انداز مکالمہ نگاری کے زمرے میں آتا ہے۔ کرداروں کی نفسیات، خیالات اور جذبات کی عکاسی کہانی میں دلکشی کا باعث بنتے ہیں جس کی بدولت کردار اپنی نظریاتی کہانیاں پیش کرتے ہیں اور یہی مکالمے ناول نگار کی شخصیت کے بھی عکاس قرار دیئے جاتے ہیں۔ اصغر ندیم سید کے ہاں مکالمہ نگاری حقیقت اور تخیل کے حسین امتزاج سے نمو پاتی ہے۔ ان کے مکالمے ہر طبقے کی زبان کو بیان کرتے ہیں۔ وہ جیسا کردار منظرِ عام پر لاتے ہیں اسے ویسی ہی زبان کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔:

"اچھے مکالمے لکھنا ایک فن ہے۔۔۔۔۔ اچھا مکالمہ قصہ کو ایک روشنی بخشتا ہے اور کردار کو ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔" [۷]

کائنات کے حسین مناظر کو تحریر کا حصہ بنانا ایک مشکل تکنیک ہے لیکن یہ مناظر تخلیق میں جان ڈالتے ہیں اور قارئین کو متاثر کرتے ہیں۔ ناول میں منظر کشی کے لئے وافر مواقع میسر ہوتے ہیں۔ اصغر ندیم سید کو منظر کشی و ماحولیاتی عکس پر مکمل عبور حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" منظر نگاری سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ مکالمے کی طرح اس ناول میں منظر نگاری کے فن سے حسین مناظر پیش

کئے ہیں۔ بارش اور صبح کی پہلی کرن اصغر ندیم سید کو بہت پسند ہے اسی وجہ سے ان کے ناول کئی جگہ بارش، موسم اور شام و صبح کے حسین مناظر کو دکھایا گیا ہے۔:

''شہر کا موسم بدلا۔ چیت کے آتے ہی شہر کی پھلواڑیاں مہکنے لگتیں۔ صبح دم ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ ہر طرح کے پرندے اِدھر اُدھر سے اُمڈ آتے اور قدیم ایام کے بنائے گئے پارکوں اور باغ بغوچیوں کے گرد لگے درختوں پر ڈیرہ ڈال دیتے۔''[۸]

اصغر ندیم سید منظر نگاری میں اپنی قوتِ مشاہدہ سے کام لیتے ہوئے خوبصورت طریقے سے جزئیات کے فن کو بھی برتتے ہیں۔ ناول ''ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر'' اپنے عہد کی علمی، ادبی اور فکری محفلوں کی روداد ہے جس میں اس وقت کے مسائل اور بدلتے ہوئے سماجی اور معاشی اقدار اور جاگیر درانہ گھرانوں سے وابستہ لوگوں اور ان سے جڑے ہوئے قصوں کو بیان کیا گیا ہے۔

اصغر ندیم سید کا دوسرا ناول ''دشتِ امکاں'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا، ناول کا مرکزی کردار انس اور اس کی بیوی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جو لوگ پاکستان آئے ان میں سے کچھ نے کاروباری وسائل پر قبضہ کر کے غریبوں کو غریب تر بنا دیا ہے۔ ایسے افراد فیکٹریاں، پلازے اور شاپنگ مال بنا کر قابض ہو گئے۔ یادداشت کھونے کی وجہ سے انس اپنی بیوی کو مختلف ادبی شخصیات جیسے احمد فراز، فیض احمد فیض اور ساقی فاروقی وغیرہ سے ملاقات پر بضد ہوتا ہے تاہم بیوی اپنے ڈرائیور کو سمجھا کر بھیجتی ہے کہ کیا جواب دینا ہے، اسی وجہ سے وہ مختلف توجیحات پیش کرتے ہوئے ٹال مٹول سے کام لیتا ہے۔ اگر کوئی فلم دیکھ لے تو اس کا حصہ بن جاتا ہے جس کی بدولت وہ اپنی بیوی شہر بانو کو کبھی سوزین کے نام سے پکارتا ہے اور کبھی کھترائن سے۔ یہ کردار قیام پاکستان کے احوال و آثار پر بھی فکر مند دکھائی دیتا ہے۔ عہدِ حاضر میں پاکستان نے آزادی جیسی نعمت کے باوجود اس کی قدر و منزلت سے آگاہی کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنی روایات کو اپنانے کی بجائے آج بھی ہندو رسم و رواج کی تقلید کرتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت آزادی کے حصول میں مسلم عورتوں کی جس طرح عزتیں پامال کی گئیں اس کی عکاسی گہری سوچ و فکر میں مبتلا کرتی ہے۔:

''اب ان عورتوں نے جب مردوں کو گرتے دیکھا تو اپنے جسموں سے چیتھڑے اتار پھینک دیئے ایک عورت غصے اور نفرت سے حکم دینے والے کی طرف بڑھی اور جب اس کے قریب پہنچی تو اس کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔''[۹]

مرکزی کردار انس کبھی امریکہ میں موجودگی کا اظہار کرتا ہے اور وہاں کی تاریخی حیثیت کا برملا اظہار کرتا ہے اور کبھی لاہور کے ہوٹلوں میں ان کھانوں کا ذکر کرتا ہے جب وہ اپنے ادیب دوستوں کے ہمراہ لاہور میں خوبصورت لمحات گزارتا تھا، وہ پاکستانی تاریخ پہ غور کرتے ہوئے اس افسردہ گھڑی پہ ماتم کرتا ہے کہ پاکستان بننے سے ان لوگوں کو فائدہ ہوا جو اوسط درجے کے تھے، اسی وجہ سے وسائل پر بھی قابض ہوئے۔ مل جل کر رہنے کے دلائل عارضی ثابت ہوئے جب کہ حقیقت میں ایسا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بٹوارہ انتہا پسندوں کے لیے جنت ثابت ہوا جس ن کے بارے میں انس اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے کہ اگر پاکستان بننا تھا تو اس میں بہاولپور، قلات، بنگال اور حیدرآباد پنجاب کی چار ریاستیں نمایاں حیثیت اختیار کرتیں۔

انس فلم دیکھتے ہوئے اس کا حصہ بن جاتا ہے۔وہBucket list فلم دیکھتا ہے جس میں دو مرکزی کرداروں کی بدولت کہانی آگے بڑھتی ہے وہ تیسرا کردار انس خود بن جاتا ہے۔ فلم دیکھتے ہوئے وہ تاج محل کے بارے میں بات کرتا ہے کہ ممتاز محل جنگی مہم سے قافلے کی واپسی پر تیرھویں بچے کو جنم دیتے ہوئے وفات پا جاتی ہے۔ فلم اختتام پذیر ہو جاتی ہے لیکن انس کے ذہن میں واقعات تسلسل سے جاری رہتے ہیں اسی طرح وہ اگر کوئی پینٹنگ دیکھتا ہے تو اس کی پوری ہسٹری بتا دیتا ہے کہ کیوں بنی ہے نیز اس میں تصویریں کون سی باتیں کر رہی ہیں۔ ایک کہانی ختم ہوتے ہی دوسری شروع ہو جاتی ہے، اسے اپنی زندگی میں گزرے ہوئے تمام واقعات یاد آتے ہیں۔ جیسے کلیم اللہ جو افغانستان میں طالبان کے ساتھ ٹریننگ کرتا ہے اور ان کے کام کاج سنبھالتا ہے پھر وہاں سے بھاگ نکلتا ہے لیکن پاکستان زندہ پہنچتا کیسے ہیں اس بارے نہیں بتایا گیا۔ امریکہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر دنیا پر راج کرنا چاہتا ہے۔:

"وہ جانے سے پہلے کہہ رہا تھا کہ امریکہ دنیا میں تیسری جنگ عظیم ہتھیاروں سے نہیں چھیڑے گا وہ کوئی وائرس بنائے گا اسے دنیا میں پھیلا دے گا۔" [۱۰]

ناول "دشت امکاں" فنی لحاظ سے مضبوط ناول ہے۔ مکالمہ کسی بھی صنفِ نثر اور شاعری کا اہم جُز ہے۔ جو کرداروں کی نفسیاتی، جذباتی اور خیالات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ناول، افسانے اور ڈرامہ میں مکالمے کے ذریعے ہی کرداروں کی پہچان ہوتی ہے، کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا رہن سہن کیسا ہے۔:

"مکالموں کا موقعہ و محل سے مناسبت رکھنا بھی ضروری ہے۔ انہیں کرداروں کی ذہنی سطح اور معاشرے کے مطابق ہونا چاہیے۔" [۱۱]

مکالمہ نگاری تخلیق کار کی تخلیق پر چار چاند لگا دیتا ہے۔ اصغر ندیم سید کی دوسری تحریروں کی طرح ناول "دشت امکاں" میں بھی مکالمہ نگاری کے ذریعے بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

کائنات کا حسن اپنی تحریر میں بیان کرنا ایک مشکل کام ہے لیکن یہ مناظر تخلیق کو خوبصورت بنا دیتے ہیں، جس کی بدولت قاری میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے ، یہ مناظر بیک وقت اپنے اندر خوشی اور اداسی دونوں طرح کی کیفیت کے عکاس ہیں۔ کچھ لوگ اس کیفیت سے سکون اور خوشی پاتے ہیں اور کچھ اکیلے پن اور اُداسی کو خود پر طاری کر لیتے ہیں۔ اصغر ندیم سید کو منظر کشی پر مکمل عبور حاصل ہے انھوں نے اپنی تخلیقات میں فطرت کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اسی طرح ناول "دشت امکان" میں بھی انھوں نے اپنے اس فن کا بڑی مہارت سے استعمال کیا ہے ،ناول میں کھیت، شام، پودوں اور پھلوں کا ذکر بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔:

"پھلوں میں سیبوں اور انگوروں کے بعد بھی دکھائی دیے۔ کھیتوں میں ہر طرح کی سبزی لہلہا رہی تھی شام بہت سرد تھی لکڑی کے ایک پرانے پاٹک میں گاڑی داخل ہوئی اور رک گئی ایک چھوٹا ٹریکٹر اور زرعی آلات ایک طرف رکھے ہوئے تھے گویا یہ کسان کا گھر تھا۔"[۱۲]

ہر ادیب اور شاعر نے اپنے انداز، محسوسات اور لگاؤ کے اظہار کے لیے منظر کشی کو مرکزی اہمیت دی ہے۔ اصغر ندیم سید کی تحریروں میں زبان و بیان کے علاوہ منظر نگاری کا بھی خیال رکھا گیا تخلیق کار کی یہ خوبی بھی بہت اہم ہے کہ وہ قاری کو ذہن میں رکھ کر لکھتا ہے۔ ناول " دشت امکان " میں بھی نہایت آسان فہم انداز اختیار کیا گیا ہے۔:

"کچھ نہیں جی پوری بات یہ ہے کہ میرے اندر تبدیلی ہوتی رہی۔ مجھے اس وقت پتہ چلا جب بچہ میری گود میں آ گیا اب میری بہن نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا کہ اس کا گھر بچ جائے میں جہاں بھی جاتی تھیں لوگ مدد کے بدلے میرا جسم مانگتے تھے۔ ایک دن آخر میں نے بچے کے ساتھ خود کو مارنے کی کوشش کی اور میں نے ایک نہر میں چھلانگ لگا دی۔ کوئی ظالم دیکھ رہا تھا مجھے بچانے کے لیے کود گیا۔"[۱۳]

اصغر ندیم سید کی تخلیقی صلاحیت سے ہر کوئی واقف ہے، ناول " دشت امکاں " میں اعلی عہدوں پر فائز، شعراء و ادیبوں کی بہت سی سچائیاں بیان کی گئی ہیں جو ہر کوئی نہیں جانتا۔ وہ تاریخ و تہذیب کے بڑے کرداروں کے ساتھ ہم کلام ہوتے ہیں۔

اصغر ندیم سید کا ناولٹ "آدھے چاند کی رات" انسانی رشتوں کی نزاکت اور جذباتی کیفیات اور نفسیات پر مشتمل ہے۔ نفسیات میں انسان کی شعوری و لاشعوری دونوں طرح کی صورتحال کو شامل کیا جاتا ہے۔ اصغر ندیم سید انسانی نفسیات چاہے مرد ہو یا عورت کو بہتر انداز سے ناولٹ میں بیان کرتے ہیں۔ مرد کی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ وہ جب کسی میں دلچسپی لیتا ہے تو بار بار اس کے دل پر دستک دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جائے وہ ہار نہیں مانتا۔

بشیر احمد اور ماہ رُخ دو مرکزی کردار ہیں پیشے کے لحاظ سے دونوں سکول ٹیچر اور رشتے میں میاں بیوی ہیں، لیکن یہ ازدواجی رشتہ بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ بشیر احمد رنگین مزاج کا آدمی ہے۔ مرد خود کو آزاد سمجھتا ہے، دوسری شادی بھی کر سکتا ہے، وہ اپنے گھر کی عورت یعنی ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کو غلام بنا کر رکھنا چاہتا اور ان کی مرضی سے سانس لینے تک کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ ہمارے معاشرے کی تلخ حقیقت ہے کہ عورت کے مقدر میں صرف ظلم برداشت کرنا ہی لکھا ہے، وہ آزاد نہیں ہو سکتی یہاں تک کہ اگر ایک بیوی طلاق لینے کا فیصلہ بھی کر لے تو یہ معاشرہ اسی کو قصوروار سمجھتا ہے۔:

"مرد چاہے عورت کو اپنے سے الگ کیوں نہ کر دے، طلاق دے دے یا علیحدگی اختیار کر لے، لیکن اس کے اندر کا آدمی یہی چاہتا ہے کہ وہ عورت کسی اور مرد کے متعلق سوچنے کا تصور بھی نہ کرے بس اسی کی داسی بن کر بیٹھی رہے۔ سنسان ہو جائے، اجاڑ ہو جائے۔ عجیب بات ہے اس کا شوہر کسی اور کا شوہر بن چکا ہے اور ایک آباد زندگی گزار رہا ہے لیکن ماہ رُخ ابھی بھی اس کی زنجیر سے بندھی ہوئی ہے۔ غلامی کا ایک کڑا اس کے پاؤں میں پڑا ہوا ہے۔"[۱۴]

اس ناولٹ میں ایک معصوم بچے عامر کی نفسیات اور جذبات سے بھرپور کردار کی عکاسی کی گئی ہے۔ کم عمری میں ماں سے علیحدہ ہو جانا ایک بچے کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ عامر کے ماں باپ میں علیحدگی کو ناول نگار نے خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ جب ماں باپ صرف اپنی زندگی کے بارے میں سوچتے ہیں تو اس سے بچوں کی نفسیات پر اثر پڑتا ہے، اس کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

ماہ رُخ کی کوئی سہیلی نہیں تھی اس لیے اُس نے اپنے آپ کو ہی سہیلی بنالیا تھا۔ اکثر وہ بذاتِ خود دل کے دروازے میں بند کر کے باتیں کرتی تھی۔ جب ماہ رُخ گھر میں تنہا ہوتی تو اپنا اکیلا پن ختم کرنے کے لیے خود سے ہی ہم کلام ہوتی۔ منظر نگاری پر اصغر ندیم سید کو مہارت حاصل ہے۔ سادہ الفاظ اور عام فہم انداز میں بہترین منظر کشی کرتے ہیں۔:

"یہ آدھے چاند کی رات تھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ چاند اس میں سے جھانک رہا تھا۔ سفید برف درختوں پہ اون کے گولوں کی طرح جمی ہوئی تھی۔ کمرے میں حالات اب بہت بہتر ہو چکے ہیں۔ عامر بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے بازو اور پاؤں پر چوٹیں آئی تھیں۔"[۱۵]

عورت معاشرے کے ہر مرد کے مطابق ایک کمزور مخلوق ہے مگر یہ درست نہیں ہے، وہ مضبوط، بہادر اور حالات سے ذہنی طور پر مقابلہ بھی کرتی ہے۔ انا پر بات آجائے تو اکیلی ہی زندگی گزار لیتی ہے مگر کسی مرد کا سہارا نہیں لیتی۔ عورت اگر ماں ہو اور جب بچے پر آجائے تو وہ خاندان، شوہر اور عاشق سے بھی لڑ جاتی ہے، وہ سب کو چھوڑ دیتی ہے سوائے اپنی اولاد۔ جب ماہ رخ کی زندگی سے بشیر احمد اور فیصل اپنے مقاصد پورے کر کے چلے جاتے ہیں تو صرف عامر ہی اس کا سہارا اور زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ اس ناول میں انسانی جذبات و احساسات کے علاوہ عورت پر کئے جانے والے ظلم، استحصال اور جبر و تشدد کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔

مکالمے کے بغیر کوئی نثری ادب مکمل نہیں ہوتا ہے۔ اصغر ندیم سید کی تخلیقات کی بات کی جائے تو ان کے ناول "ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر" اور ناولٹ "آدھے چاند کی رات" میں بے شمار مکالمے ملتے ہیں۔ کبھی یہ مکالمہ واحد متکلم کا صیغہ، کبھی فلیش بیک تکنیک اور کبھی دو افراد کے مابین ہوتا ہے۔ "آدھے چاند کی رات" میں زیادہ تر خود کلامی کا عنصر نمایاں ہے۔ ماہ رخ ضرورت پڑنے پر دل میں مقید سہیلی سے گفتگو کرتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ مکالمہ دو افراد کے اظہارِ خیال کا عکاس ہے۔ اس ناول کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ اسلوب بھی رواں اور تسلسل سے پیش کیا گیا ہے۔ فلیش بیک تکنیک اور صیغہ واحد کے علاوہ ناول میں سوالیہ انداز بھی ملتا ہے۔ اصغر ندیم سید بنیادی طور پر فکشن کی فضاؤں میں زندہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ وہ ڈوبتی، سسکتی اور سانس لیتی تہذیب کا نوحہ گر ہیں اور اس بات پر ہمیشہ شاکی رہے ہیں کہ کارپوریٹ کلچر نے اردو کی تہذیب کو بے شناخت کیا ہے۔ اصغر ندیم سید اردو ڈراما نگاروں کے اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں کہ جو کمرشل ازم کی بجائے کہانی کو مقدم جانتے ہیں۔ یہی کیفیت ان کے ناولوں کی بھرپور عکاس ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقا، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء) ص: ۷۷

۲۔ عرفان جاوید، دور حاضر میں حمدیہ و نعتیہ ادب کا جائزہ، (لاہور: روزنامہ دنیا، ۷ دسمبر ۲۰۱۹ء)

۳۔ Nasir Abbas Nayyar, "Diary of a city (Asgar Nadem Syed)", the news on Sunday ۱۲ January ۲۰۲۰ء

۴۔ ارشد وحید، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر، (لاہور:، ڈان نیوز، ۱۸ اپریل ۲۰۲۰ء) بک ریویو

۵۔ اصغر ندیم سید، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء) ص: ۶۷

۶۔ ایضاً، ص ۴۵

۷۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے، (لاہور: اردو اکادمی، ۱۹۶۴ء) ص: ۲۰

۸۔ اصغر ندیم سید، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر، ص: ۹۷

۹۔ اصغر ندیم سید، دشتِ امکاں، (لاہور،: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء)، ص: ۶

۱۰۔ ایضاً، ص: ۸۱

۱۱۔ محمد شاہد حسین، ڈراما فن اور روایت، (بھوپال: اقبال لائبریری، ۱۹۹۲ء) ص: ۲۸۳

۱۲۔ اصغر ندیم سید، دشتِ امکاں، ص ۲۴۵

۱۳۔ اصغر ندیم سید، آدھے چاند کی رات، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء) ص: ۲۴

۱۴۔ ایضاً، ص: ۱۵

۱۵۔ ایضاً، ص: ۱۸۷، ۱۸۸